ادب میں تنقید کا جواز

پروفیسر وحید الظفر خاں

مسعود محل، سول لائن، علی گڑھ (یوپی)، موبائل: 9258130100

ادب کے حوالہ سے غالباً اس حقیقت سے گریز ممکن نہ ہو کہ ہر زندہ زبان کا ایک ادب ہوتا ہے، اور ادب کی ایک زبان ہوتی ہے، اور ہر زبان کی اپنی ایک ساخت، ایک ہیئت، ایک مخصوص محاورہ، مزاج اور آہنگ ہوتا ہے۔ جس کے زرّیں سطح پر تہذیبی، تمدنی، ثقافتی لہریں مرتعش رہتی ہیں۔ گویا ادب ایک جسم ہوتا ہے اور زبان اس کی روح، جو اس کو متحرک اور توانا رکھتی ہے۔ وقت کے بہتے دھارے میں ادب کے پانیوں کی رنگت اور رفتار بدلتی رہتی ہے۔ اس ضمن میں اہل ادب نے مختلف اصطلاحات وضع کر لی ہیں تاکہ زمانہ کے بہاؤ کے تدریجی عمل کو نشان زد کیا جا سکے، اور ان کوائف کا جائزہ لیا جا سکے جو ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں وگرنہ وقت۔ انسان اور سماج کا مثلث ہی دنیا کے ہر ادب کا نمائندہ ہے۔ وقت ہر ادب میں زندہ رہتا ہے، اور عظیم ادب ہر وقت میں زندہ رہتا ہے۔ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات، واقعات و نظریات سے کبھی متاثر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ عظیم ادب انسانی زندگی کی نفسیاتی پیچیدگیوں، روحانی کرب، ذہنی تصادم، خیر و شر کی محاذ آرائی اور وجود و عدم کی پُر اسراریت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ساتھ ہی ان فلسفیانہ یا بعد الطبیعاتی سوالوں کے گم شدہ جوابوں کو استعاروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو انسان کی فطری جستجو کا ماحصل ہیں۔ اس لیے وہ زمان و مکان کی دست درازیوں سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ زمین کی سرحدیں ہوں یا وقت کی طنابیں۔ عظیم ادب کے لیے بے معنی ہیں۔ ہر دور میں ہر سماج کا انسان اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ عظیم ادب ہر دور میں ہر مقام پر ہمیشہ تر و تازہ اور توانا رہتا ہے اور ہر فرد اپنے بکھرتے سنورتے خوابوں کو اس میں تلاش کر سکتا ہے۔

دوسری سطح پر جو ادب وقوع پذیر ہوتا ہے یقینی طور پر حالات و تجربات، واقعات و نظریات کے بدلتے ہوئے رجحانات کا منعکس ہوتا ہے۔ ایسے ادب کو اگر عصری ادب کے زمرہ میں رکھ لیا جائے تو مضائقہ نہیں، کیوں کہ سماجی عوامل سے متاثرہ ادب تاریخی پس منظر کا شاہد بھی ہوتا ہے اور معاشرتی زندگی کا معتبر گواہ بھی۔

سماجی ذہن کی تربیت میں بدلتی ہوئی اخلاقی و تہذیبی قدریں ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہیں جس سے تخلیقی شعور بدلتا ہے اور ادب میں ڈھلتا ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کے افسانے اور ناول ایک تاریخی یادگار یا ہندوستان کا ایک تاریخی اثاثہ کی حیثیت سے اہم ہو سکتے ہیں، لیکن دورِ حاضر کے ذہن میں اسطوری ماحول اور کردار بن کر اُبھرتے ہیں۔ کیوں کہ اس دور کی حقیقت آج صرف ایک خواب پریشان ہے یا ایک چونکا دینے والا تکلیف دہ سچ جو ماضی میں دفن ہو چکا ہے۔ اس دور کے دبے کچلے اور معصوم لوگ آج ایک ایسی طاقت بن کر اُبھرے ہیں جس میں فرماں روائی کے ساتھ عیش و عشرت کے تمام لوازمات میسر ہیں۔ کل کے جھکے ہوئے سر آج تنے کھڑے ہیں اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ وہ پُر غرور سر جو اپنے پیروں میں غریب کے سر کو ٹھوکر مارتے تھے آج اسی قوم کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں۔

پریم چند اپنے دور کے سماجی تقاضوں، سیاسی انتشار اور تعلیمی تحدید کی بنیاد پر ایک عظیم منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے اُبھرتا چلا گیا۔ نہ کوئی حریف نہ کوئی تنقید۔ اگر کچھ تھا تو صرف تعریف۔ کیا دورِ حاضر میں پریم چند اپنے قابل ترین حریفوں کے درمیان اس مقام پر پہنچ پاتا؟ یہ سوال دورِ حاضر کے ترقی پذیر ادب کا ہے جس کے فتراک میں تنقیدی شعور کی بالادستی بھی موجود ہے اور ساتھ ہی افسانہ نگاری کا معیاری فہم بھی اور تخلیقی صلاحیت کا جوہر بھی۔

یہ نصف صدی سے زیادہ پرانی بات نہیں کہ انگریزی ادب کے مطالعہ نے اردو ادب میں دراندازی شروع کر دی تھی۔ دھیرے دھیرے انگریزی ادب و تنقید کی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے کا فیشن سر چڑھ کر بولنے لگا۔ نان شبینہ کی جگہ کیک کا نیا نیا سا ذائقہ سب کو اچھا لگا۔ اردو ادب کے وہ دانشور جو اردو کو عربی اور فارسی کے رشتہ سے جانتے تھے آئینۂ حیرت بن گئے۔ انگریزی کی وساطت سے مستعار مغربی علم کی کمائی سے کافی لوگوں کا اردو زبان میں سکّہ جم گیا۔ جو انگریزی سے ناواقف تھے وہ

مرعوب ہوکر اپنی بقا کی جدوجہد میں ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اردو ادب کو ملمع شدہ زیورات سے آراستہ کیا جانے لگا۔ مغربی دانشوروں کے اقوال اور تنقیدی نظریات کو ان کے نام کے ساتھ اس طرح لکھا جانے لگا جیسے وہ ایسے صحیفے ہوں جو ادب میں حرف آخر کی سند رکھتے ہوں۔ اردو ادب کا عام قاری جب انگریزی مقولہ جات اور مغربی نظریات کی زد میں آتا ہے تو سمجھتا کم ہے مرعوب زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ مشہور مغربی نام اور مستعمل اصطلاحات یاد کرنے کے بعد اردو ادب کے بارے میں گفتگو مغربی ناموں کے وسیلے سے کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی قابلیت اور اہلیت کا معیار سبک نہ گردانا جائے۔ بعض اردو ادب کے سکّہ بند مضمون نگار مغربی مفکرین کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ ان کے بہت قریبی دوست ہوں اور ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے ہوں۔ اس گفتگو کا ہرگز یہ مقصد نہ سمجھا جائے کہ مغربی ادبی نہی عن المنکرات میں سے کوئی شے ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ مغربی تنقید و ادب پر آج تک جو کچھ بھی لکھا جا چکا ہے اس سے اردو ادب کی ترویج و ارتقا پر کتنا مفید اثر پڑا ہے۔ تنقید کی وہ اصطلاحات جو باقاعدہ مغربی مفکرین کے ناموں سے اردو زبان میں منتقل ہو چکی ہیں۔ اردو تنقید میں کس طرح اور کس انداز سے استعمال میں لائی گئی ہیں۔

زندہ زبان اور زندہ سوچ یعنی متحرک فکر سے جو ادب وجود پذیر ہوتا ہے اس ادب میں تنقید کا رجحان بے حد قوی ہوتا ہے۔ مغربی ادب میں تنقید اور نظریاتی ردّ و قبول کا سلسلہ اسی لیے دراز رہتا ہے کہ وہاں سوچنے، کہنے اور لکھنے کی پوری آزادی ہے۔ نہ تو اشاعت پر کوئی قدغن ہے اور نہ ہی مدیروں کی خوشامد پسندی کا چلن اور نہ ہی تحسین باہمی کی گروہ بندی۔ بے لاگ تبصرہ اس قوم کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اس لیے صرف ادبی تنقید کی نو بہ نو اصطلاحات وضع کی جاتی رہتی ہیں جس کی بنا پر باقاعدہ ایک دبستان تنقید وجود میں آچکا ہے۔ جو قوم غور سے پڑھتی ہے، سوچتی ہے، پرکھتی ہے اور آزاد رائے رکھتی ہے۔ وہاں ہمیشہ ادب میں ارتعاش پایا جاتا ہے۔ وہاں شخصیت پرستی اور انفرادی توصیف کے بجائے منطقی دلائل اور مربوط براہین کا آمیزہ تیار کیا جاتا ہے۔ نظریاتی اختلاف اور جدت طرازی "Analytical Sensibility" تجزیاتی درک سے اُبھرتی ہے جہاں علمی سطح ہر طرح کے تعصب سے بلند ہوتی ہے۔

اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے مغربی ادب و تنقید کا علم بحیثیت علم بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ افہام و تفہیم کی تربیت کے لیے وژن اور بصیرت میں ہر لحہ وسعت درکار ہوتی ہے۔ جو فکر اور تجزیاتی شعور کو جلا بخشتی ہے۔ مغربی علوم کا حصول اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ ادب کے مختلف گوشوں سے واقفیت رہے اور دنیا کے علمی رجحانات کا اندازہ ہو سکے اور تقابلی مطالعہ سے ادبی تخلیق کو نئی سمت اور نئی سوچ مل سکے۔

جو شعری ادب مرثیہ اور قصیدہ سے اُبھرا ہوا اور مثنوی کی آرائش خم کا کل میں الجھا ہو وہاں سوائے غلو کے اور کیا ملے گا۔ تنقیدی رجحانات کے امکانات تقریباً کالعدم، سنجیدہ تنقید، سنجیدہ ادب کی تخلیق میں نمائندہ کردار ادا کرتی ہے۔ کسی حد تک تنقید کے عمل کو ایک نازک سرجیکل آپریشن کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے جو صحتمند ادب کی ضمانت بن سکتا ہے۔ تنقید کی چاہے جتنی بھی اصطلاحات وضع کر لی جائیں، لیکن کھری اور سکّہ بند تنقید صرف معروضی اور متن سے وابستہ تنقید ہے جس کا واحد مقصد قاری کے ذہن کی گرہ کشائی کے ساتھ تخلیق کار کی کسی حد تک کشادہ فکری بھی ہے۔ عام قاری کے ذہن میں ایسے گوشے اکثر سوال طلب رہ جاتے ہیں جن کا واضح اور مدلل جواب ایک دانشورانہ تنقید سے مل سکتا ہے۔ دانشورانہ تنقید تعلم و تفکر اور تفہیم کا احاطہ کرتی ہوئی براہِ راست متن کی کشادگی کرتی ہے۔ جس طرح سائنس کی ترقی مادّہ کی تجزیاتی تشریح اور اس کے عمیق مطالعے کا نتیجہ ہے اسی بنیاد پر متن کو مادّہ سمجھ کر ہی تنقید کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اردو ادب کی شعری دنیا میں معیاری شاعری کی تجزیاتی عقدہ کشائی پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی شاعروں کے کوائف و معاصرین کے رسمی روایاتی اور تاریخی تذکروں پر کیوں کہ معیاری شاعری معیاری تنقید کی متقاضی ہوتی ہے، اور معیاری تنقید کے لیے تشریح، تجزیہ اور تعبیر تینوں کا ایک منطقی تلازمہ ضروری ہے۔

اردو سہ ماہی مجلّہ اثبات (جون تا اگست ۲۰۰۸ء) نقشِ اوّل) میں ''جدید تنقید، منصب اور طریقِ کار کی جستجو'' کے عنوان سے ندیم احمد کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں تنقید کے حوالہ سے سند کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کا تجزیہ دو اشعار کے حوالہ سے شامل کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے تنقید شعور کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن اچھے شعر کی خوبی اس کی تہہ داری اور معنی آفرینی میں مضمر ہوتی ہے، اس لیے کسی بھی تنقید کو حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ میرؔ کے مشہور شعر:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اسی کارگہ شیشہ گری کا

کے ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کی درج ذیل تنقید کو سند کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ تنقید کی غایت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

''صاحبِ نظر جب کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کی رنگا رنگی اور پیچ

در پیچ نزاکت کو دیکھ کر حیرت میں آجاتا ہے۔ ہر چیز انتظام سے چل رہی ہے، کہیں کوئی انتشار نہیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت نازک اور پیچیدہ کارخانہ ہے۔ صاحبِ نظر کو محسوس ہوتا ہے کہ اگر زور کی سانس بھی لی تو یہ سب درہم برہم ہوجائے گا یا شاید یہ سب کچھ ایک خواب ہے جو ذرا سے اشارے پر برہم اور منتشر ہوسکتا ہے۔'' (شمس الرحمٰن فاروقی، 'شعر شور انگیز'، جلد: اوّل، ص:۲۵۲)

مزید گفتگو سے پہلے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ شعر کی تشریح تجزیہ اور تعبیر کے مراتب کا ایک مختصراً جائزہ لیا جائے۔

تشریح: کسی شعر میں الفاظ کے دروبست کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے متن کی اس طرح وضاحت کرنا جس کے ذریعے بنیادی مفہوم کا کوئی پیکر اُبھر سکے اور معنویت تک رسائی کے امکانات واضح ہوسکیں۔ اس ضمن میں شعر کی صحیح قرأت کا قرینہ اساسی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جس طرح علاج سے پہلے صحیح تشخیص ضروری ہے ورنہ مریض کی صحت خطرے میں پڑسکتی ہے اُسی طرح صحیح تشخیص نہ ہونے پر شعر کی صحت کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ گویا تشریح کو شعر کے بسط وکشاد کا پہلا قدم کہا جاسکتا ہے۔

تجزیہ: تشریح کے بعد تجزیہ شعر کا وہ پُر مغز مطالعہ ہے جو براہِ راست شعر کی رمزیت، سریّت اور داخلی ارتعاش کی نشاندہی کرتا ہے اور معنویت کی تہہ داری کے ساتھ ساتھ فکر وفلسفہ کے بلیغ جہات کا تعین کرتا ہے۔ تجزیہ کا عمل شعر کے جسم میں روح کی تلاش کے مرادف قرار دیا جاسکتا ہے۔ گویا شعر کے داخلی ڈھانچہ میں جو صنعتِ شعری مرتعش ہے اس کا فعال کردار شعری پیکر کی تشکیل میں کس انداز میں نمایاں ہے؟ اور صوتی آہنگ یا نغمگی کا تاثر شعر کے ارتقا میں معنویت کے ساتھ کس طرح منسلک ہے؟ اور مفہوم کے بتدریج ارتقا میں لوازمات شعری کا کیا روّیہ ہے؟ شاعر کا وژن اور اس کی شعری ترکیب وتعمیر میں اس وژن کی فن کارانہ آمیزش جمالیاتی قدر کو کس طرح بروئے کار لائی ہے؟

اسی کاوش کے لیے تجزیاتی درک (جسے Analytical Sensibility کہا جاسکتا ہے) اور ادبی بصیرت Literary Insight بے حد اہم عناصر ہیں۔

تعبیر: جس طرح ہر معبر کسی خواب کی تعبیر اپنے اپنے انداز سے کرتا ہے اور اپنی دانشورانہ صلاحیت سے نتائج اخذ کرتا ہے اسی طرح کسی شعر یا کسی ادب پارہ کی تعبیر صاحبِ نظر کی وسعت نظر، فہم وادراک اور شعوری رسائی کی حامل ہوتی ہے اس لیے مختلف زاویۂ نگاہ کی بنیاد پر تعبیروں کے مختلف پیکر ہوسکتے ہیں۔ معیاری شعر اور معیاری شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک Prism کی مانند دھنک رنگ برقی شراروں سے منور رہتی ہے۔ زاویۂ نگاہ جس سمت کا تعین کرتا ہے اس سمت کے برقی شراروں سے دمکتا رنگ نظر آتا ہے جو یقیناً اسی (چندری) Prism میں موجود متحرک رنگوں کا ایک لابدی حصّہ ہے۔ گویا معنویت کے مختلف رنگ کسی بھی معیاری شعر میں اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ ہر زاویۂ نگاہ کی سمت کسی نہ کسی رنگ کا نظارہ کرسکتی ہے اور شعر میں پوشیدہ تہہ در تہہ معانی کے کسی پہلو کا ادراک حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی گریز ممکن نہیں کہ مفہوم کی ترسیل کی توثیق صرف توجیہ سے ممکن ہے کیوں کہ منطقی شعور دلائل کی نمائندگی چاہتا ہے جو ذہنی تجسس کی کفالت کرسکے، اور ساتھ ہی متن کے دائرے سے تجاوز نہ کرے البتہ عظیم شاعری ایک گہرے سمندر کی مانند ہوتی ہے جو اہلِ نظر کو ہمیشہ اپنے بطن میں پوشیدہ موتیوں کے حصول کے لیے غواصی کی دعوت دیتی رہتی ہے، لیکن کوئی غواص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ سمندر کا آخری موتی نکال لایا ہے۔

آیئے اب متذکرہ شعر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تشریح، تجزیہ اور تعبیر کا عملی جائزہ لیا جائے۔

تشریح: ''لے سانس بھی آہستہ'' کا براہ راست تعلق فن شیشہ گری سے ہے۔ دورِ حاضر میں شیشہ گری کی صنعت مشینوں کی مرہون منت ہے، لیکن جس دور میں یہ شعر کہا گیا ہے اس وقت یہ فن انسان کی صنعت و حرفت سے عبارت تھا۔ شیشہ گری کا فن انتہائی احتیاط، باریک بینی، خود پر مکمل کنٹرول، ذمہ داری، قلب وذہن کی ہم آہنگی، مکمل سپردگی، یکسوئی اور ہمہ تن انہماک چاہتا ہے۔ کیوں کہ شیشہ کے آبگینہ بنانے کے لیے کاری گر ایک نلکی کی مدد سے پگھلے ہوئے گرم شیشہ کو اپنی سانس کے زیر وبم سے کسی شکل میں ڈھالتا ہے۔ شاعر نے شیشہ بنانے کی ورک شاپ کی تمثیل سے انسان اور کائنات کے رشتہ کی اہمیت کے ساتھ اس دنیا (ارض) میں زندگی گزارنے کے عمل کو ایک ایسا ہی نازک کام بتایا ہے جیسے گرم سیال شیشہ کو سانس کے زیر وبم سے کسی شکل میں ڈھالنا۔ اس عریض و بسیط آفاق میں زمین ہی وہ چھوٹا سا سیارچہ ہے جسے انسان کے لیے کارگہ کے طور پر تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ ہی وہ فیکٹری ہے جس کے اندر اوزار، ہتھیار، خام مال اور شیشہ پگھلانے والی بھٹیاں وغیرہ سب کچھ موجود ہے، اور استعارتاً انسان شیشہ گری کی صلاحیت کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ ''آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری'' میں لفظ ''اِس'' دنیا کا واضح اشاریہ ہے۔ جیسے کسی شہر میں موجود کسی شیشہ بنانے والی فیکٹری کو منسوب کیا جاتا

ہے۔ بعینہٖ آفاق میں موجود اس کارگہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

تجزیہ: اس شعر کے بیرونی ڈھانچہ میں تین مختلف اکائیاں۔ انسان، آفاق اور کارگہ موجود ہیں جو غیر مرئی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ شاعر نے اسی ربط کی اہمیت کو اس شعر میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو داخلی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہوکر ایک بڑی اکائی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ Microcosm اور Macrocosm دونوں کی یکجائی کا نام Cosmos بھی ہے۔ انسان اور دنیا (کارگہ) دونوں آفاق کے جزولاینفک ہیں۔ ''کارگہ'' یعنی دنیا انسان کے لیے دارالحزن بھی ہے اور دارالعمل بھی۔ انسان کی کارکردگی کے ضمن میں شاعر کا مشورہ بلکہ Word of Caution اس لیے بھی اہم ہوجاتا ہے کہ انسان کو جو Free will دی گئی ہے اس کے استعمال میں اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے جس کی پاداش میں مقصد حیات کو زک پہنچ سکتی ہے۔ ''لے سانس بھی آہستہ'' کا مشورہ اس لیے دیا گیا ہے کہ انسان سانس زور سے لینے پر بھی قادر ہے۔ شاعر انسان کو توازن اور اعتدال کے ساتھ Art of Living کے طریقہ کو اپنانے کی تربیت کی طرف مائل کرتا ہے اور اس زندگی کے مقصد کی وضاحت فن شیشہ گری کی عملی نزاکت اور نفاست کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ تاکہ انفس وآفاق کے درمیانی رشتہ کی حکیمانہ غایت نمایاں ہوسکے۔ کسی شعر یا کلام کی معنویت اور اہمیت اسی وقت مستند مانی جاسکتی ہے جب اس میں کوئی وژن، فکر یا فلسفہ انسانی ذہن کی علمی اور ذہنی استعداد میں اضافہ کا سبب بنے۔ شاعری کی باریک بینی قابل داد ہے کہ اس نے ایک عمومی تجربہ سے انسانی فلسفۂ حیات کو انتہائی فن کارانہ ڈھنگ سے پوری تاثیریت کے ساتھ صوت وآہنگ کے نغمہ میں ڈھال دیا ہے۔ ''سانس لینا'' زندگی گزارنے کے عمل کی توجیہ ہے جو زندہ اور مردہ میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ انسان کو دنیا میں خیر وشر کی قوتوں اور مثبت ومنفی صلاحیتوں کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ جہاں جہد پیہم مقصد حیات ہے جیسا کہ قرآن کا فرمان ہے ''**لیسَ للانسان الاماسعٰی**''، لیکن ساتھ ہی عقل وخرد اور فکر وفہم دے کر اس شعور سے بھی نوازا گیا ہے جو ''**خُذ ماصفادع ماکدر**'' پر اصرار کرتا ہے۔ آفاق کی بیکراں وسعتوں میں ایسا کوئی دوسرا مقام نہیں جہاں انسان اپنی عملی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کا اہل ہو۔ اس لیے ''لے سانس بھی آہستہ'' میں تابعداری، ادب اور خوف تینوں عناصر کا حسین ترین تلازمہ موجود نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی شیشہ گر کے لیے سیال شیشہ کو مختلف شکلوں میں ڈھالنے کا نازک کام اس کے تخلیقی درک اور صلاحیت کا آئینہ دار بھی ہے اور اس ودیعت کردہ صلاحیت کو سلیقہ سے برتنے کا اختیار بھی۔ اس شعری پیکر میں جو اخلاقی قدر پیوست ہے وہ آفاقی نظام کی اقدار کا ایک لازمی جز ہے۔ آفاقیت کا یہ ہی وہ عنصر ہے جو شعر کو زمان ومکاں کی حدود سے ماورا لے جاتا ہے۔

تعبیر: کائنات کے زندہ اور متحرک وجود کو محض فریب نظر کی ساحری قرار دینا یا خواب سمجھنا ایک انتہا پسند نظریہ ہے جو انسان کی قوت عمل کو مفلوج اور امکانی ارتقا کی راہوں کو مسدود کرتا ہے۔ یہ کائنات انتہائی توازن اور اعتدال اور ایک منضبط قانون کے تحت اپنی بنیادوں پر مستحکم ہے۔ خالق نے متعدد علامات کے ذریعہ اور ایک مربوط نظام (Growth & Decay) کے ذریعہ وضاحت کے ساتھ انسان کی تخلیق کا مقصد حیات بتادیا ہے۔ جبر واختیار کے دائرہ میں اس کو کس نظم وضبط کے ساتھ زندگی گزارنا ہے اور امر ونہی کے اس کارخانہ میں کس احتیاط کے ساتھ متحرک رہنا ہے۔ بہرحال احتیاط کے پہلو کو مدّ نظر رکھتے ہوئے تابعداری، شکرگزاری اور باہمی اتحاد ہی وہ کارِ شیشہ گری ہے جس کی طرف شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کیوں کہ آفاق کے اس دارالعمل میں یہ ہی کام بے حد مشکل ہے جس کے لیے ہر انسان جواب دہی کا ذمہ دار ہے اور ذاتی طور پر نتائج کو بھگتنے والا بھی۔

اس ضمن میں فارسی کے اس شعر کا مفہوم زیادہ قریب نظر آتا ہے:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردئ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

سورۂ والشّمس میں بھی اس شعر کی ترکیبی کائنات اور انسان کی ذمہ داری کی واضح ہدایت موجود ہے۔ خاص طور پر یہ دو آیات **قد افلح من ذکّٰھا وقد خاب من د سّٰھا**، شعر کی تعبیر ہیں، لیکن سورہ کا سیاق وسباق مفہوم کی شرح میں زیادہ کشادگی کرتا ہے۔ سطحی طور پر اس شعر میں ''کارگہ شیشہ گری'' اکثر مغالطہ پیدا کرتا ہے کیوں کہ کائنات کو شیشہ کی عمارت سمجھ لیا جاتا ہے۔ آیئے اب دوسرے شعر پر نظر ڈالتے ہیں:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

''اس متن کا تجزیہ کرتے وقت اور چیزوں کے علاوہ اس امکان پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے کہ ''زنداں میں بھی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ شورش جنوں کے علاج کی اور بھی تدبیریں ہوچکی ہیں اور ناکام رہی ہیں (فاروقی) اور پھر اس کے تخلیقی مشتملات اور صوتی امکانات کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ''شورش کے ساتھ آشفتہ سری کتنا مناسب ہے اور خود شورش اور جنوں میں رعایت معنوی

ہے۔لفظ ''سنگ''، جس آہنگ سے مصرعہ میں استعمال ہوا ہے وہ خود اشارہ کرتا ہے کہ سر کو دھما کے لیے پتھر سے ٹکرانا ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، ''شعر شور انگیز'' جلد: اوّل، ص: ۲۴۹)

اس سے پہلے کہ اس شعر کے بارے میں مزید گفتگو کی جائے اس شعر کی نثر کر لی جائے۔ ''اپنے جنوں کی شورش زنداں میں بھی ختم نہ ہوئی اس لیے اب اگر اس آشفتہ سری کا کوئی مداوا باقی ہے تو وہ صرف سنگ ہے گویا پتھر سے سر ٹکرا کر شوریدگی اور آشفتگی سے نجات پانا ہے۔

جنون، شورش اور آشفتہ سری تینوں کیفیتیں ذہنی کج روی اور دماغی عدم صحت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بظاہر ان کیفیات کا محرک عشق میں ناکامی ہے۔ جنون عشق سے پیدا ذہنی خلفشار، زنداں تک لے گیا، لیکن وہاں بھی سکون وصحت کی کوئی سبیل نہ نکلی۔ دوسری تدبیریں بھی کی گئیں، لیکن ناکام ہوئیں۔ اب آخری تدبیر یعنی سنگ سے شاید مسئلہ حل ہو جائے۔

اردو ادب کی کلاسیکل شاعری میں اس طرح کا روایتی شاعرانہ عشق اکثر عشقیہ شاعری میں گل بوٹے کھلاتا رہا ہے، وصل کی طلب کی بے چینی اور محبوب کی کج ادائی عاشق کو اکثر ایک جنونی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جب تہذیب وشائستگی کی قدریں منہدم ہونے لگتی ہیں تو عاشق کو بغرض صحت پاگل خانہ کے بجائے قید خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ معاشرہ اس کی بے ضابطگیوں اور جنونی حرکات سے محفوظ رہ سکے، لیکن اس شعر کا عاشق حالتِ جنون میں بھی ہوشیار ہے اس لیے خود ہی اپنے جنون کا علاج بھی تجویز کرتا ہے اور برملا کہتا ہے۔ ''اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا''، سارا معاملہ ہجر سے وصل تک کا ہے اس کے بعد نہ شورش نہ آشفتہ سری اور نہ جنونی کیفیت۔ شیکسپیئر کے الفاظ میں "There is a method in his madness" اس شعر میں اگر کوئی شعری خوبی ہے تو وہ سنگ کی معنویت سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر پتھر سے سر ٹکرانا ہی علاج ہے تو زنداں کی دیواروں سے کیوں نہ ٹکرایا۔ دراصل شاعرانہ مکر سے کام لے کر محبوب کے سنگ در کی طرف اشارہ ہے۔ شاید محبوب کی نظر عنایت ہو جائے یا اسی بہانے اس کا دیدار ہو جائے یا عاشق کی حالت زار پر اس کو رحم آجائے اور اس طرح سنگ در آشفتہ کا مداوا بن جائے۔

لفظ ''سنگ'' کو ابہام کے طور پر ذو معنی قرار دیا جاسکتا ہے۔ سنگ کے دوسرے معنی ''ساتھ'' کے بھی مستعمل ہیں اس لیے محبوب کا سنگ (وصل) ہی اس ذہنی شوریدگی کا مداوا ہے۔

شعر سیدھا سپاٹ اور تغزل کا ایک پیکر ہے جس میں کوئی فلسفیانہ موشگافی کوئی قدر (Value) یا تفکر کی گہرائی شاید کسی خوردبین کی منتظر ہو۔

اگر ادب کے مطالعہ کا مقصد فکر وفہم میں بالیدگی، علم میں وسعت اور وژن میں رفعت پیدا ہونا ہو تو اس شعر سے یہ مقصد حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس معیار کے اشعار کی تشریح تو ممکن ہو سکتی ہے اور ساتھ ہی تعبیر کے لیے بھی ہر ذہن آزاد ہے، لیکن تجزیہ (جو تنقید کا ایک لازمی عنصر ہے) کے لیے جن عوامل کی موجودگی ضروری ہوتی ہے اس شعر میں اہل صفا یا عارفین کو نظر آسکتی ہے۔ کیوں کہ اس شعر کے متن میں 'تن' تو ہے مگر روح کی تلاش کار فرہاد سے کم نہیں۔ شوریدگی کی کیفیت مندرجہ ذیل شعر میں ملاحظہ فرمائیے اور حسن معنی کے سحر میں کھو جائیے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

یہ تحریر حرف آخر نہیں کیوں کہ صاحب فہم وفراست کے لیے تلاش کے پہلو ہمیشہ امکان کی زد میں رہتے ہیں اور ادب میں فروغ کے لیے شخصیت کے تعین قدر سے زیادہ تفہیم قدر ضروری ہے جو کسی ادب پارہ کی رگ رگ میں پیوست ہوتی ہے اور تنقیدی بسط وکشاد کے لیے چشم براہ رہتی ہے۔ شعر اور شاعری کے معیار کا تعین سنجیدہ تنقید سے ہی ہو سکتا ہے، اور تنقید، تشریح، تجزیہ اور تعبیر کی Totality کا نام ہے۔

○○

قلمکاروں سے گزارش

- ہمیں آپ کی گراں قدر نگارشات کا بہت بڑا ذخیرہ بذریعہ ڈاک وای۔میل موصول ہوتا ہے جس میں زیادہ تر مضامین، شاعری اور افسانے/کہانیاں ہوتی ہیں، وقت کی کمی کے باعث سب کا جواب دینا یا نگارشات واپس کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس کو آپ ہماری بے رخی پر محمول نہ کریں بلکہ ہماری مجبوری سمجھیں۔ اگر تین ماہ کے اندر آپ کی تخلیق شائع نہ ہو یا اشاعت کے بارے میں اطلاع نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ ادارہ اس کی اشاعت سے قاصر ہے۔
- قلمکاروں سے ایک گزارش اور ہے کہ بذریعہ ای۔میل اپنی تخلیقات بھیجنے سے قبل اپنی تخلیقات کو ایک بار ضرور پڑھ لیں تاکہ اس میں پروف کی غلطیاں کم سے کم رہیں۔ —ادارہ